ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.1 (2025)
(January to March)

# محمد حفیظ خان کا ناول "ادھ ادھورے لوگ": سماجیاتی مطالعہ

# Muhammad Hafeez Khan's Novel "Adh Adhoray Log": A Sociological Study

**محمد ادریس**
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان
**ڈاکٹر رافعہ ملک**
شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان

**Muhammad Idrees**
Ph.D Urdu Scholar, National College of Business Administration and Economics, Multan
MIdrees122310325@ncbaemultan.edu.pk
**Dr. Rafia Malik**
Department of Urdu, National College of Business Administration and Economics Multan
rafiamalik7151@gmail.com

**Abstract:**
This study presents a sociological analysis of Muhammad Hafeez Khan's novel Adh Adhoore Log. The narrative reflects contemporary social issues, class conflicts, and the intricate human relationships of urban life. The paper highlights how the author effectively portrays social currents, traditional values, and individual struggles through his characters. By analyzing the novel's structure, character development, and thematic dimensions, the study concludes that Adh Adhoore Log serves as a significant literary work for raising social awareness and understanding the nuances of human psychology.

**Keywords:** Muhammad Hafeez Khan, Adh Adhoore Log, Sociological Study, Social Issues, Class Conflict, Characterization

محمد حفیظ خان اکیسویں صدی کے ایک ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے حالیہ برسوں میں کئی بہترین ناول لکھ کر اردو ادب میں اپنا مقام بنایا ہے۔ وہ اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں ناول لکھتے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے منفرد اُسلوب اور نقطۂ نظر کی بنیاد پر اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اب تک شائع ہونے والے ناولوں میں ادھ ادھورے لوگ، انواسی، منتارا اور کُرّک ناتھ، حیدر بخش کا گوٹھ اور ہر ایک جنم کی جانما شامل ہیں۔ محمد حفیظ خان ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ کو احمد پور شرقیہ کے ایک محلہ باکھری میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سرائیکی وسیب سے ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں سرائیکی لب و لہجہ اور ثقافتی رنگ نمایاں ہے انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم احمد پور شرقیہ کے پرائمری سکول سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ صادق پبلک سکول، بہاول پور سے پاس کیا۔ گورنمنٹ انٹر

کالج بہاول پور سے انٹر میڈیٹ مکمل کرنے کے بعد ایس ای کالج بہاول پور سے گریجویشن کی۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لاہور سے سپریئر یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی۔ سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے پہلے محکمہ ڈاک میں بطور آڈٹ آفیسر تعینات ہوئے اس کے بعد بطور ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر تقرر رہوا۔ اس دوران سول جج کا امتحان بھی پاس کیا اور ریڈیو پاکستان میں بطور پروڈیوسر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ حفیظ خان نے ناولوں کے علاوہ افسانے، ڈرامے اور مورخ کے طور پر بھی اپنی صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔

ناول "ادھ ادھورے لوگ" ۲۰۱۸ء میں پہلی مرتبہ جہلم بک کارنر سے شائع ہوا۔ ۲۰۱۹ء میں دوسری مرتبہ اور ۲۰۲۱ء میں اس کی تیسری اشاعت ہوئی۔ اس ناول کا بنیادی موضوع خطہ بہاولپور کی تہذیب و ثقافت، تاریخ اور مسائل ہیں۔ ناول کا کینوس ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عرصہ پر محیط ہے یہ وہ عرصہ ہے۔ جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور قیام پاکستان کا خواب بھی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ بہاول پور کے مسلم اکثریت کے حامل لوگ ریاست کا الحاق پاکستان سے چاہتے تھے۔ انہی کی خواہش کے مطابق نواب صادق عباسی خامس نے ریاست کا الحاق پاکستان سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ریاست بہاولپور کے باسیوں کے مسائل بڑھتے گئے اور ان کی شناخت بھی چھن گئی۔ یہ سادہ دل اور محبت کرنے والے لوگ اپنی ریاست کے حکمران نواب محمد صادق عباسی سے نہایت محبت و عقیدت رکھتے تھے لیکن ریاست بہاولپور کے پاکستان میں انضمام کے بعد محرومیاں بڑھیں، غربت اور بے روزگاری کی صورتحال پیدا ہوئی تو یہاں کے لوگوں کے دلوں میں بہاولپور کی اپنی تہذیبی و تاریخی اور جغرافیائی شناخت کو دوبارہ بحال کرنے کی ایک کسک پیدا ہوئی جو ایک تحریک میں بدل گئی۔ "ون یونٹ" کے خلاف سب سے زیادہ مزاحمت اسی خطہ میں ہوئی جنرل یحی خان کی حکومت ون یونٹ کے خاتمے پر آمادہ تھی مغربی پاکستان کے باقی چاروں صوبوں کو تو اپنی شناخت واپس مل گئی لیکن بہاول پور صوبہ نہ بن سکا اس خطہ کے لوگوں کی قربانیاں رائیگاں گئیں۔ اس خطہ کے لوگ آج بھی اپنے حقوق کے لیے سراپا احتجاج ہیں اور صوبہ بہاولپور کی بحالی کے منتظر ہیں۔ محمد حفیظ خان نے اس صورتحال کو اس ناول میں نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس خطہ کے لوگ گہرا سیاسی و سماجی شعور رکھتے ہیں اور ان کی تحریک پاکستان سے لے کر صوبہ بہاول پور بحالی کی تحریک تک اس خطہ کے لوگوں کی تمام سیاسی مسائل پر گہری نظر کی عکاسی اس ناول میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ حفیظ خان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے خورشید ربانی رقم طراز ہیں:

> "ایک بڑے قلم کار کی تخلیق پرانی نہیں ہوتی۔ وہ ہر دم تازہ اور نئی رہتی ہے۔ قاری پر بار بار کی قرأت سے امکانات منکشف کرتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں حفیظ خان کی تحریر میں موجود ہیں۔"(۱)

حفیظ خان نے اس ناول میں نا صرف یہ کہ بہاول پور کی تاریخ کو موضوع بنایا ہے بلکہ انھوں نے انسانی نفسیات کے بہت سے پیچیدہ پہلوؤں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ نوجوان لڑکیوں، لڑکوں اور شادی شدہ افراد کے جنسی مسائل، ایک فرد کا اپنی ذمہ داریوں سے فرار اور زندگی کے حقیقی مسائل سے چشم پوشی جیسی صورتحال ہے جو اس ناول میں حقیقی زندگی کی تلخیوں کو حقائق کو بالکل اسی انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے وہ موجود ہوں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سے اس ناول کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ "فیاض" اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کا والد نذیر حسین نواب صادق عباسی کے گارڈز کے دستے میں شامل ہے اور نواب کا محافظ خاص ہے۔ جو دوسری جنگ عظیم میں بھی شرکت کر چکا ہے۔ فیاض کا چچا محمد حسین بھی ریاست کا سپاہی رہ چکا ہے اور ماموں محمد مراد صادق گڑھ پیلس کی سیکورٹی پر مامور ہے۔ نواب کی پولیس اور فوج میں اہم عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے یہ افراد

ریاست کی سیاسی سرگرمیوں سے بخوبی واقف اور گہرا سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کی تحریک زوروں پر ہے، ریاست بہاولپور پاکستان یا بھارت سے الحاق کا معاملہ اُن کے درمیان زیر بحث ہے اور ان کی دلی خواہش ہے کہ نواب ریاست کے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کر لے لیکن نہرو کی بہن لکشمی بیگم کی پیلس میں آمد کی خبر اُن میں بے چینی پیدا کر دیتی ہے۔ ان کرداروں کے خیالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ناول نگار لکھتے ہیں:

> "نواب صاحب کے باڈی گارڈ دستے کے ملازم ہونے کی حیثیت سے تینوں اپنے اپنے اندازوں کو برحق سمجھ رہے تھے۔ نذیر حسین اور جان محمد کو اس بات کا یقین تھا کہ ریاست بہاولپور پاکستان میں شامل ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اس کا فطری سنجوگ ہے بھی پاکستان کے ساتھ اور ہو گا بھی پاکستان کے ساتھ۔ دوسری جانب محمد حسین کی رائے بھی نظر انداز کرنے کی نہیں تھی کہ اگر ریاست نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا ہوتا تو پھر نواب صاحب نے مائی لکشمی کو اس طرح کیوں بلایا ہوا ہے۔ آخر کوئی بات تو ہو گی نا اگر انکار ہی کرنا ہوتا تو بندا دور ہی سے کر دیتا ہے۔ اپنے ہاں آنے نہیں دیتا۔ مگر ایک تگڑی دلیل ہونے کے باوجود محمد حسین کے پاس کوئی ایسا ٹھوکواں ثبوت نہ تھا جو اس کے تجزیے کی ضمانت بن سکتا۔ یہی حال نذیر حسین اور جان محمد کا تھا کہ جن کے پاس بھی محض دل کی بھڑاس تھی اور کوئی ایسی خوشو نہیں تھی جو ریاست کی پاکستان میں شمولیت کی دلیل بن سکتی۔"(۲)

دراصل کانگرس کے راہنما پنڈت لال نہرو اور مسلم لیگ کے راہنما قاعد اعظم محمد علی جناح دونوں کے نواب محمد صادق عباسی خامس سے گہرے تعلقات تھے اور دونوں رہنماؤں کی خواہش تھی کہ ریاست بہاولپور ان کے حق میں فیصلہ دے۔ ریاست میں مسلم آبادی غالب اکثریت میں تھی جب کہ ہندو اور سکھ بھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور ریاست کے کاروبار ہندوؤں کے پاس تھے۔ پنڈت نہرو ہر حال میں نواب کو الحاق کے لیے راضی کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد بر آوری کے لیے نواب کو کئی پیش کش بھی کیں جن میں ایک یہ تھی کہ وہ راجستھان کا ایک اچھا خاصا علاقہ اپنی ریاست میں شامل کر لیں لیکن الحاق بھارت کے ساتھ کریں ان کی بہن کی نواب کے ہاں آمد کی بھی یہی وجوہات تھیں رحمت خان وردگ کے مطابق:

> "قیام پاکستان سے قبل پنڈت نہرو نے اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت کے ذریعے نواب بہاولپور کو متعدد بار پیغامات بھجوائے کہ وہ راجستھان کا کچھ علاقہ بھی ساتھ ملا کر بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر لیں لیکن نواب آف بہاولپور نے ریاست بہاولپور کا الحاق پاکستان سے کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔"(۳)

نواب بہاولپور ریاست کی غالب اکثریت کی منشا جانتے تھے اور مسلم ریاست ہونے کے باعث انھوں نے پاکستان سے الحاق کو ترجیح دی۔ لیکن قیام پاکستان کے اعلان سے قبل ہی ریاست بہاولپور مذہبی منافرت کی صورتحال ڈگر گوں ہو چکی تھی۔ احمد پور شرقیہ اور بہاولپور میں تصادم اور فسادات کے اکا دکا واقعات بھی سامنے آئے لیکن نواب صاحب کے منظم حفاظتی انتظامات کی بدولت یہ واقعات باقاعدہ فسادات کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ کچھ مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی املاک پر نظر جمائے بیٹھے تھے اور وہ ہر صورت یہ املاک

ہتھیانا چاہتے تھے۔ ناول کے کردار ودھو اور امام مسجد کے علاوہ پیری بد معاش کا کردار ایسے داغ نما کردار ہیں جو اقلیتی ملکیتی املاک کو ہتھیانے کے لیے سر پیر مار رہے تھے۔ جبکہ مذہبی اقلیت چاہتی تھی کہ انہیں اپنے گھروں میں امن وسکون سے رہنے دیا جائے اس صورتحال کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے:

> "ریاست کی مذہبی اقلیت کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ انہیں اپنے گھروں سے نہ نکالا جائے، اور نہ ہی بے وطن کیا جائے۔ ان کا تو جینا مرنا اسی دھرتی کے ساتھ ہے اور یہی ان کی پہچان ہے۔ اس سوچ کا سبب نواب صاحب کی جانب سے دلائی جانے والی یقین دہانیاں بھی تھیں۔ مگر اس کے باوجود ریاست کی ہندو آبادی بھانپ چکی تھی کہ ریاست میں اب ان کے دن گنے جا چکے ہیں نسل در نسل ایک ہی گلی میں رہنے والے ہم دیوار ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے نہ معلوم خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ہر کوئی کسی ان دیکھی مصیبت کے انتظار میں گھبرایا ہوا سا پھر رہا ہے یا پھر کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہے جو کسی وقت کہیں بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔"(۴)

دراصل اس وقت پورے ہندوستان میں زبردست فسادات ہو رہے تھے سکھ اور ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں پر خوفناک مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور انہیں اپنی املاک اور گھروں سے بے دخل کرنے کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری اور اغوا کے علاوہ مسلمانوں کے قتل عام جیسی صورتحال نے نہایت کشیدگی پیدا کر رکھی تھی اسی صورتحال کے اثرات ریاست بہاولپور میں بھی نمودار ہو رہے تھے۔ لیکن نواب صاحب نے خصوصی اقدامات اُٹھا کر اقلیتی آبادی کو سرحد پار کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ناول میں اقلیتی برادری کا اہم کردار حکیم رام لال ہے جو بحفاظت اپنے خاندان کو بھارتی حدود میں داخل کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کا سبب ایک ریاستی پولیس اہلکار تھا جس کا نام محمد نواز جمعہ دار تھا جس نے پولیس کی جیپ میں اس خاندان کو بحفاظت سرحد پار کروائی محمد حفیظ نے اس واقعہ کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

> "اپنے ہم وطنوں سے چوری چھپے یہ پانچ افراد جیپ کے عقبی حصے میں گسڑ مسڑ کر بیٹھ گئے۔ جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کے ساتھ براجمان ایک مسلح سپاہی نے ان کو قلعہ دراورڑ سے آگے مڑیچی والی جھوک پر پہنچا کر واپس آنا تھا۔ جیپ کے ٹائروں میں جنبش ہوئی تو محمد نواز جمعدار کے ساتھ ساتھ فیاض نے بھی رخصتی کے لیے ہاتھ ہلایا۔ مگر جیپ کے اندر سے کچھ دکھائی نہ دیا۔"(۵)

اقلیتی ریاستی آبادی کی ہجرت کے بعد اور قیام پاکستان اور ریاست بہاولپور کے پاکستان سے الحاق کے بعد ریاست کے سادہ لوگ نہایت خوش تھے جبکہ بعض مفاد پرست قبضہ گروپ ہندوؤں اور سکھوں کی املاک ہتھیانے کے لیے باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔ حکیم رام لال جانے سے پہلے امانت کے طور پر اپنی ساری جائیداد جس میں شہر کا گھر اور ڈیرہ نواب کا مطب خانہ شامل تھا فیاض کے نام کر گیا اور اسے تاکید کی تھی کہ اگر حالات بہتر ہوئے تو وہ واپس لوٹ آئے گا اور اپنی امانت واپس لے لے گا اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ سب کچھ فیاض کا ہے اور یہ سب کچھ باقاعدہ پکے کاغذات تیار کروا کر فیاض کے حوالے کر گیا تھا۔ فیاض ایک نہایت دیانت دار اور امین نوجوان کے روپ میں سامنے آتا ہے اور اس کو امانت کی حفاظت کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کر دیتا ہے۔ ودھو ریڈیو پر قیام

پاکستان کا اعلان سننے کے بعد حکیم کی دکان پر قبضہ کرنے کے لیے کچھ دوستوں کے ہمراہ جب دکان پر پہنچتا ہے تو وہاں "محمد نواز جمعدار" اور اس کے سپاہی اور ان کے عقب میں محمد فیاض دکان سے نکلتے ہیں جو اسے سمجھاتے ہیں کہ دکان حکیم صاحب کی تھی اور وہ اسے فیاض کے نام کروا گیا ہے اسے کاغذات بھی دکھائے جاتے ہیں لیکن وہ ہمت ہارنے کی بجائے سینہ زوری کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> "اوے چل چل۔۔۔۔ یہ سب جھوٹ ہے سیدھی نیت سے حکیم کو باہر نکال نہیں تو دکان کے ساتھ ساتھ تمھیں بھی جلا کر راکھ کر دوں گا۔"(۶)

لیکن ودھو کی دھمکی کام نہیں کرتی اور پولیس اسے حوالات میں بند کر دیتی ہے۔ اس کے بعد امام مسجد دکان پر قبضہ کرنے کے لیے پہنچتا ہے لیکن پولیس قبضے کی اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیتی ہے۔ اس کے بعد فیاض کا اپنا چچا اور پیری بدمعاش حکیم کا مکان ہتھیانے کے لیے اس پر مقدمہ بازی کا آغاز کرتے ہیں زمین کے اصلی کاغذات کی وجہ سے فیاض ان کو بھی ناکام بنا دیتا ہے۔ بہاولپور کی ریاست کی اصلی شناخت ختم کر کے اس کو نواب صاحب کی طرف سے پاکستان میں بطور صوبہ ضم کرنے کے فیصلے کے ریاست کی عوام پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ عوام اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں اور فیاض بھی احتجاج کرنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے جو ہر صورت ریاست کی اصل شناخت کی بحالی چاہتا ہے۔ دوسری طرف مشرقی پنجاب سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد ریاست بہاولپور کی زمینوں پر اپنا حق سمجھتے ہوئے ادھر کا رخ کرتی ہے۔ جس سے ریاست کی مقامی آبادی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ریاست پر غیر ریاستی افسران کا تقرر مقامی آبادی کے لیے مسائل میں زبردست اضافہ کر دیتا ہے۔ ناول میں اس صورتحال کو حفیظ خان نے یوں بیان کیا ہے:

> "ریاست کے بعد صوبہ بننے کے اس عمل نے عوامی زندگی کے ہر پکھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ریاستی ملازموں کی ایک بڑی تعداد ملازمتوں سے فارغ ہو کر گھروں کی ہو رہی۔ ہڈیوں ٹوٹا تو کما کھائے مگر دل ٹوٹا کیسے کمائے والا حال تو پہلے ہی تھا مگر ان کے شب و روز کو مزید پاتال میں دھکیل دیا۔ یہاں آباد ہونے والے مہاجروں نے کہ جنھوں نے اپنی محنت سے پوری سابقہ ریاست کے کاروبار خاص طور پر جنس اجناس کی منڈیوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔"(۷)

محمد حفیظ خان کے مطابق اس صورتحال نے فیاض جیسے نظریاتی ریاستیوں کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا اور اسی کے بعد بہاولپور میں نواب صاحب کے لیے حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ نواب صاحب گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے دباؤ پر ریاست کو بطور صوبہ پاکستان کا حصہ بنانے کے بعد دیوار سے لگ چکے تھے۔ ریاست میں امن و امان اور غربت جیسے مسائل نے بیزاری کی فضا قائم کی۔ لیکن ون یونٹ کا قیام ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے یہاں کے عوام کو سیخ پا کر دیا بہاولپور کی صوبائی حیثیت کا خاتمہ عوام کے اشتعال کا سبب بن گیا۔ رحمت خان وردگ کے مطابق:

> "پاکستان کے تیسرے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ کو ون یونٹ منصوبے کا اعلان کیا اور اکتوبر ۱۹۵۵ کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں بشمول بہاولپور کو ضم کر کے

مغربی پاکستان صوبہ کا نام دیا۔ اس کاروائی کے وقت نواب بہاولپور سے تحریری معاہدہ کیا گیا تھا کہ جب کبھی صوبے بحال کیے گئے تو بہاولپور کو صوبے کا درجہ دیا جائے گا۔"(۸)

ون یونٹ کے قیام کے بعد بہاولپور میں صوبہ بحالی تحریک کا آغاز ہوا۔ ناول کا کردار فیاض ایک ایسا کردار ہے جو اس تحریک کا متحرک کردار بن کر ابھرتا ہے اور ون یونٹ کے خلاف عوامی امنگوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ دوسری طرف صوبوں میں اس فیصلے کے خلاف مزاحمت شروع ہوتی ہے خان عبد الغفار خان اس تحریک کے رہنما کے طور پر ابھرے جس کا نام "اینٹی ون یونٹ فرنٹ" تھا۔

فیاض کو اس تحریک میں ناول نگار کے بقول اپنی گم شدہ شناخت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اس کا حصہ بن کر نہ صرف بھرپور مزاحمت کا آغاز کرتا ہے بلکہ اپنے مطب کے سامنے بھی اس کا بورڈ لگا دیتا ہے۔ پورے ملک میں ون یونٹ فرنٹ کے خلاف کریک ڈاؤن شروع ہوتا ہے اور فیاض کو بھی بھینس چوری کے مقدمہ میں گرفتار کر کے بغیر مقدمہ چلائے دس سال تک قید میں رکھا جاتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر پیری بدمعاش حکیم کے مکان پر اور ودھو حکیم کی دکان پر قبضہ کر لیتا ہے کہ جو اب فیاض کے نام تھیں۔ یہاں پر ناول نگار نے ملک میں لاقانونیت اور ریاستی جبر کی ایک جھلک پیش کی ہے کہ کیسے سیاسی قیدیوں کو کسی جرم کے بغیر دس سال تک قید رکھا جاتا ہے۔

"فیاض کا کسی عدالت میں پیش کیے بغیر دس برس تک جیل میں پڑے رہنا یہاں فوجداری نظام انصاف کے ناقص ہونے کی دلیل تھا۔ وہاں عدالتی تاریخ کا ایسا واقعہ تھا کہ جس کے طشت از بام ہونے پر بڑی بڑی کرسیاں نہ صرف ڈگمگا سکتی تھیں بلکہ ٹوٹ کر گر بھی سکتی تھیں۔ یہ ایک ایسا مقدمہ تھا جس کا ملزم اپنے اوپر لگے الزام کے ثبوت، سماعت اور فیصلے کے بغیر ہی جرم کی مقرر کی گئی سزا سے تین گنا زیادہ قید بھگت چکا تھا۔ جیل حکام کے پروردہ مجسٹریٹ نے بھی جیل افسروں کو بچانے کی خاطر جلدی جلدی فیاض کو رہا کرنے کا حکم سنایا اور اگلے قیدی کو پیش کرنے کا اشارہ کر دیا۔"(۹)

دس سال کی قید کے بعد فیاض ۱۹۶۶ میں قید سے رہائی کے بعد چند سال تو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے لیکن اس دوران ریاست میں صوبہ بحالی اور ون یونٹ کے خلاف تحریک زور پکڑ جاتی ہے۔ ایک روز ہائی سکول کے راستے سے گزرتے ہوئے ہائی سکول کے لڑکوں کی ریلی پر پولیس کے لاٹھی چارج کے دوران راہگیر بھی پولیس کے جبر کا نشانہ بنتے ہیں اور ان میں فیاض بھی بازو تڑوا بیٹھتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ عملی سیاست میں شریک ہو جاتا ہے لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۷۰ کو فرید گیٹ کے سامنے متحدہ محاذ کے ایک بڑے جلسے کو ناکام بنانے کے لیے پولیس سیدھی گولیاں چلاتی ہے تو فیاض بھی گمنام گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ رات گئے قلعہ دراوڑ سے آگے ریت کے ٹیلوں میں پولیس ان مرنے والوں کو دفنانے جاتی ہے تاکہ قتل و غارت کے تمام ثبوت مٹا دیے جائیں۔ فیاض کی لاش بھی ان میں شامل ہوتی ہے جو ریاست کی شناخت کی بحالی کی جدوجہد میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے سینکڑوں لوگوں میں شامل ہے جو گمنام موت مارے گئے۔ یوں اس ناول کی داستان کا ایک پہلو اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ریاست بہاولپور میں آج بھی اپنی شناخت کی جدوجہد جاری ہے جو اب بہاولپور کو صوبہ بنانے کی جدوجہد کا روپ دھار چکی ہے صوبہ پنجاب بارہ کروڑ سے زیادہ آبادی کا حامل صوبہ ہے جس میں اس وقت جنوبی پنجاب صوبہ، صوبہ ملتان اور صوبہ بہاولپور کے علاوہ بعض عناصر سرائیکستان کے عنوان سے ایک نئے صوبے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

دراصل قیام پاکستان سے اب تک اس خطہ کے مسائل بڑھتے چلے گئے ہیں اور غربت اور بے روزگاری نے صورتحال ابتر کر دی ہے۔ اتنی بڑی آبادی کے صوبہ میں یکساں اور مساوی سلوک، روزگار کے یکساں مواقع، وسائل کا منصفانہ استعمال ایک بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن سیاسی مفادات اور بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر ابھی تک اس خطہ کے عوام کے جائز مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے۔ حالانکہ بھارت میں اس دوران کئی ایک صوبوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔ بارہ کروڑ آبادی کے انتظامات احسن طریقے سے چلانا وسائل کی کمیابی کی بدولت ناممکن ہو چکا ہے اور دارالحکومت لاہور تک رسائی کی بدولت اپنے حقوق اور ملازمتوں کے حصول کے لیے پہنچ رکھنا خاص طور پر جنوبی پنجاب کے اضلاع رحیم یار خان، بہاولپور، لودھراں، راجن پور، لیہ اور ڈیرہ غازی کے لوگوں کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پنجاب کی صوبائی اسمبلی اور قومی اسمبلی سے نئے منصوبوں کے قیام کے لیے متعدد قراردادوں کو پاس کرنے کے باوجود بھی ریاست پاکستان نظریاتی، لسانی، اقتصادی، جغرافیائی اور سیاسی محرومیوں کے ازالے کے لیے نئے صوبوں کے عملی قیام سے گریزاں ہے۔ نئے منصوبوں کا قیام ملک کے مسائل کے حل کے لیے کس قدر مفید یا نقصان دہ ہو سکتا ہے اس کا تعین کرنے کے لیے قومی مباحثوں اور مذاکروں کے ذریعے قومی اتفاق رائے پیدا کر کے حتمی فیصلے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملک کو مسائل کے گرداب سے نکالا جا سکے۔ نئے صوبوں کا قیام محرومیوں کا ازالے میں مددگار ثابت ہو سکت ہے۔

اس ناول کا دوسرا اہم موضوع مرد اور عورت کی جنسی محرومیوں کے اسباب اور وجوہات کا مطالعہ ہے۔ حفیظ خان نے اس ناول میں اپنے کرداروں کے ذریعے اس موضوع کو نہایت جامعیت کے ساتھ موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کے نسوانی کردار جنسی مسائل کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس ناول میں سب سے اہم نسوانی کردار "مہراں" ہے جو ظلم و تشدد سہتے سہتے آخر مزاحمت اور پھر بغاوت کا اعلان کرتی ہے۔ ودھو جو کہ ایک ایسا مرد ہے جو مردانہ قوت سے محروم ہے اور مہراں کو صرف اس لیے تشدد کا نشانہ بناتا رہتا ہے کہ وہ دب کر رہے اور اس کا راز فاش نہ کرے لیکن جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو وہ اپنی زبان کھولتی ہے اور ودھو کو مورد الزام ٹھہراتی ہے۔ ودھو کے تشدد اور گالیوں سے تنگ آ کر آخر ایک دن وہ اس کی مردانگی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتی ہے:

"مان لیا کہ میں بانجھ ہوں دفعہ کر مجھے اور لے آ کوئی دوسری اس گھر میں، میں بھی
دیکھوں ناں کہ کتنے دنوں بعد تمہارے بچے کھیلتے ہیں اس دالان میں۔"(۱۰)

روزانہ اچھی خاصی مار کھانے کے بعد آخر ایک دن جب وہ بغاوت کا فیصلہ کرتی ہے تو ودھو معمول کے مطابق اس پر تشدد کرنا شروع کرتا ہے تو وہ مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نا صرف خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروا لیتی ہے بلکہ اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کر کے منہ کے بل گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتی ہے۔ گردن اس طرح دباتی ہے کہ ودھو اور اس کی ماں مل کر بھی نہیں چھڑا پاتے تو ماں گلی سے فیاض کو بلا کر لاتی ہے جو بامشکل ودھو کو آزاد کروا پاتا ہے۔ یہ مہراں کی بغاوت کا نقطہ آغاز ہے جو اسے اب ودھو سے بھرپور انتقام پر مجبور کرتا ہے اور وہ دھیجر کے آنکھ بھر کر دیکھنے پر اس سے اپنے آپ کو چھپانے کی بجائے اپنا گریبان کھلا رکھنے پر اکساتا ہے۔ اور فیاض کے مطب پر جا کر اسے بچہ پیدا کرنے کے لیے جنسی کھیل کھیلنے کی کھلی آفر پر مجبور کرتا ہے اور پھر جن کا ناٹک کر کے بھوپے کے جسمانی تشدد اور بھوپے اور اس کے چیلوں کی جنسی ہوس کا نشانہ بننے کا شوق پیدا کرتا ہے اور ظلم کے پہاڑ گر جانے کے بعد بھی ایک سکون اور سرور محسوس کرتی ہے ناول نگار کے الفاظ میں:

"اگلے دن کی صبح مہراں کے لیے جنسی آسودگی کا پیغام لے کر آئی۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر
پورے بدن میں کہیں کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ اور کہیں کچھ بکھرتا جا رہا تھا۔ کسی زلزلے کے گزر

جانے کے بعد کی کیفیت تھی۔ مگر دھیمے دھیمے میٹھے میٹھے درد میں گھلے ہوئے سرور کے ساتھ یہ احساس دلائے بغیر کہ اس کیفیت کا مرکز کہاں ہے۔ عجیب سا احساس تھا کہ جیسے ایک ایک مسام میں تازگی اور مستی داخل کر دی گئی ہو۔ مگر کیا کہ اس مستی میں ایک آس سی تھی۔ تھکاوٹ سے بھری بھری جس نے اسے گھیبل بنا کر رکھ دیا تھا۔"(۱۱)

اس عنصر کو ایذا پسندی یا ایذا کوش کے اصطلاحی معنوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات کوئی فرد دوسروں سے انتقام لینے کے لیے خود اذیتی یعنی خود کو سزا یا درد سے گزارنا پسند کرتا ہے۔ صلاح الدین درویش کے الفاظ میں:

"میسوکسٹ(Masochist)ایذا طلب اور ساڈسٹ (Sadist) ایذا کوش ہوتا ہے۔ایک (Sadist) مرد ہو یا عورت دوسروں کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچا کر حظ حاصل کرتا ہے۔ جبکہ ایک میسوکسٹ جسمانی اور ذہنی اذیتوں کا دوسروں سے خواہاں ہوتا ہے۔"(۱۲)

مہراں ایسی ہی کیفیت کا شکار ہو کر خود کو جسمانی اور جنسی تشدد کے لیے پیش کرتی ہے اور ودھو کو روحانی و اخلاقی طور پر زچ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا مزاج گھر میں بھی بدل کر سامنے آتا ہے اور وہ اپنے شوہر کو نفسیاتی حربوں سے زچ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"ودھو جونہی اس کے قرب کی خواہش میں آگے پیچھے آنٹے لگانا شروع کرتا مہراں اسے دیکھ دیکھ کر آنکھیں مچکانا شروع کر دیتی کہ جیسے چیلنج کر رہی ہو۔ آ۔۔۔اب آناں، میں بھی دیکھوں بڑے طرم خان کو بہت شوق تھا نہ تجھے باپ بننے کا۔"(۱۳)

عورت کی نفسیات کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ جب وہ انتقام پر اُترتی ہے تو تمام حدیں پار کر جاتی ہے یہاں پر مہراں نے جو کھیل کھیلا وہ بھی اولاد کی خواہش کے لیے ہرگز نہیں تھا بلکہ اس نے ودھو سے انتقام کی آگ میں جھلس کا یہ قدم اٹھایا۔ بھاگ بھری جو کہ ودھو کی ماں ہے اپنی بہو کے اس سارے کھیل میں شریک جرم ہے۔ وہ پہلے مطب پر اور اس کے بعد بھوپے کے آستان پر دونوں جگہ بہو کو لے جانے سے پہلے سارے کھیل سے باخبر تھی لیکن اس کے نزدیک بیٹے کے بے اولاد ہونے کی کالک زیادہ غلیظ تھی اور یہ کم۔ کیونکہ بیٹے کے ہاں اولاد ہو جانے سے بہت سی زبانیں خاموش ہو سکتی تھیں ودھو کے کردار کا ایک نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ جنسی کمزوری انسان کے اندر بہت سی اخلاقی کمزوریاں بھی پیدا کر دیتی ہے جنسی مسائل نے اس کو ذہنی طور پر اتنا مفلوج کر دیا کہ وہ اپنے جنسی مسائل ایک حکیم کے سامنے بیان کرنے سے ڈرتا ہے اور اپنی بیوی کی من گھڑت بدصورتی کا رونا روتا رہتا ہے۔ اور اس کے اخلاقی گراوٹ کے اثرات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ سماجی تشدد پر اتر آتا ہے اور حکیم رام لال کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے متشدد سوچ اپناتا ہے۔

نسوانی کرداروں میں "تلسی" ایک منفی کردار کے طور پر سامنے آتی ہے جو احمق بھی ہے اور بزدل بھی۔ وہ اپنی ماں کو اپنی آنکھوں کے سامنے جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتے دیکھتی ہے لیکن آواز بلند نہیں کرتی۔ جانتے ہوئے بھی کہ وشنو سے اس کا جوڑ نہیں اور "سوڈمی مل" نے اس کی ماں کے بعد اس پر بری نظر رکھی ہوئی ہے پھر بھی وہ خاموش تماشائی بنی رہتی ہے حتیٰ کہ اس کی شادی کی رسومات کی ادائیگی کے دوران بھی وہ فیاض سے جنسی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کبھی بھی اس سے اپنی خواہشات کا

اظہار نہیں کرتی اس صورتحال میں فیاض اسے دل سے پسند کرنے کے باوجود بھی تعاون کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ حفیظ خان نے ناول کا عنوان "ادھ ادھورے لوگ" رکھا جو کہ اس ناول کے تقریباً تمام کرداروں کے افعال کی بنیاد پر درست بیٹھتا ہے۔ فیاض جنسی و جسمانی وجاہت سے بھرپور انسان ہونے کے باوجود درست وقت پر درست فیصلے کرنے کی صلاحیت سے محروم نظر آتا ہے اور کئی ایک مواقعوں پر منفی ردعمل کا اظہار کر کے خود کو ادھورا ثابت کرتا ہے۔

حکیم رام لال جو کہ ایک طبیب ہے اور ایک اچھی شہرت کا حامل ہے لیکن اس کی کئی ایک اخلاقی کمزوریاں سامنے آنے کے باوجود بھی اس کی شخصیت متاثر کن ہے۔ ہندو اقلیت سے تعلق ہونے کے باوجود فیاض جیسے مسلمان نوجوان پر مکمل اعتماد اور نواز جمعدار جیسے بااثر لوگوں کے ساتھ گہرے تعلقات اس اور اس کے خاندان کی جان کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ سوڈمی مل اور اپنی بیوی کی بھرپور خواہش کے باوجود تلسی کا ہاتھ وشنو کے ہاتھ میں نہ پکڑانا اور فیاض پر اتنی مہربانیاں ظاہر کرتی ہیں کہ دل ہی دل میں وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ فیاض کے ہاتھ میں دے کر دونوں کی خاموش محبت کو مکمل کرنا چاہتا تھا لیکن بدلتے ہوئے حالات نے اس کی نوبت نہ آنے دی۔

اس ناول کا ایک پہلو سماجی بداعتقادی توہم پرستی اور غیر اخلاقی عقائد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ ایک ایسی سماجی برائی ہے جو اب بھی معاشرے کی اخلاقی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ پدرسری سماج میں عورتوں کو چار دیواری کے اندر مقید رکھنے کی روش انہیں من مانے فیصلے قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہے یہ فیصلے بے جوڑ شادیوں کی صورت میں ہوں یا بروقت شادی نا کرنے کی صورت میں خصوصاً نوجوان لڑکیوں میں بہت سی جنسی مسائل کو جنم دیتے ہیں اور نوجوان لڑکیاں یا تو بیماری کا ناٹک کر کے فیاض جیسے خوبرو اور خوش شکل طبیب کے ہاتھ کا لمس محسوس کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کی بیمار بن جاتی ہیں یا پھر جن ان کے جسموں پر حاوی ہو جاتے ہیں جس کا علاج صرف بھوپے جیسے عاملوں کے پاس ہوتا ہے جو اس کیفیت کے نفسیاتی محرکات سمجھتے ہوئے اپنی جنسی و جسمانی ہوس پوری کرتے ہیں۔ ان خواتین کے اس فرضی بہروپ کا نقشہ حفیظ خان نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> " ان حسیناؤں کے جوان جسموں میں چنگاریاں سلگاتی، اضافی حدت کو نکاس کی کوئی فطری گزرگاہ نہ ملی تو اس نے ان کے بھیتر ان دیکھا الاؤ بھڑکا کر ان کے بدن سرخ آگ بکھیرتے تندور بنا دیئے۔ جوان مردوں کو ان کے کھولتے جسموں کا دارو بنا کر ان کے ساتھ بیاہا گیا تھا۔ وہ دارو ہونے کی بجائے الٹا بوسیدہ دیوار بن گئے۔ تو ان کی بیویوں کا یہ بھڑکتا بھانبڑ ان مکے چکے لوگوں کو جن بن بن کر ڈراتا تھا، دہلاتا تھا، بھڑکاتا تھا۔"(۱۴)

چنانچہ بھوپے سائیں کا آستان ایسی جن بھوت کے جکڑن میں جکڑی مہراں جیسی لڑکیوں کے وجود سے قائم تھا۔ بھوپے کی شخصیت کا نقشہ ناول نگار کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> "بھوپا انسانوں کے اس گروہ کا نمائندہ تھا جو کائنات میں موجود حسن کی پرستش نہیں کرتا، اس کے لیے روتا بسورتا نہیں، ٹھنڈی آہیں نہیں بھرتا، شاعری نہیں کرتا، موتی جیسے لفظوں کے ساتھ بنا سجا کر کہانیاں نہیں لکھتا، ہجر کی لمبی راتوں میں جاگ جاگ کر محبوب کی آرزو میں لحہ لحہ مرتا نہیں بلکہ اپنی قبضہ گیر اور تعرف پسند فطرت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمینگی کی مؤثر قوت کے بل بوتے پر مطلوب شے کو اپنی گرفت میں لے کر کاٹھ کباڑ بنا دینا اپنا حق سمجھتا ہے۔"(۱۵)

اس بیان کو ایک اور مثال کی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دنوں لاہور میں ایک پرفیوم بنانے والی فیکٹری نے پرانا اور بیکار خوشبودار کیمیکل ایک گاؤں کے قریب سڑک کنارے تلف کر دیا جس سے خوشبو کی مہک اٹھنا شروع ہوئی کسی نے افواہ پھیلائی کہ یہ ایک مقدس مٹی ہے جو کہ نہایت ہی شفا بخش اور بیماریوں اور پریشانیوں سے یقینی نجات کا سبب ہے۔ اور یوں چند دن میں اس مقدس مٹی کو خریدنے والوں کا ایک میلہ لگ گیا جو کئی دن جاری رہا فیکٹری مالکان تک اس واقعہ کی خبر پہنچی اور انہوں نے اپنی وضاحت بھی جاری کر دی۔ جس معاشرے میں توہم پرستی اور بد اعتقادی کی صورتحال اس قدر بھیانک رخ اختیار کر چکی ہو اور بد اعمالیوں اور بے دینیت نے جہالت کے گہرے اندھیرے پھیلا رکھے ہوں وہاں لا قانونیت کی موجودہ صورتحال جیسی حالت اور بھوپے جیسوں بد نما کرداروں کی قسمت کا خوب چمکنا معاشرے کی قسمت بن جاتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ خورشید ربانی، حفیظ خان شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص:۲۸

۲۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ،، بک کارنر جہلم، جہلم، ۲۰۲۱ء، ص:۳۱

۳۔ وردگ، رحمت خان، روزنامہ نوائے وقت، ۲۲۔جون ۲۰۱۹ء

۴۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص:۶۴

۵۔ ایضاً، ص:۱۴۹

۶۔ ایضاً، ص:۱۵۳

۷۔ ایضاً، ص:۱۶۰

۸۔ وردگ، رحمت خان، روزنامہ نوائے وقت، ۲۲۔جون ۲۰۱۹ء

۹۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ ص:۱۸۰

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۰۷

۱۲۔ درویش، صلاح الدین، اردو افسانے کے جنسی رجحانات، گارشات پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۱۳۶

۱۳۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص:۱۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص:۹۹

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۰۶